ڈاکٹر شازیہ رزّاق
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونی ورسٹی، لاہور

مضامینِ سرسیّد احمد خان میں افسانوی و نفسیاتی عناصر

ABSTRACT

Fictional and Psychological Elements in Sir Syed's Essay
By Dr. Shazia Razzaq, Asst. Prof., Department of Urdu, Lahore College for Women University, Lahore.

Sir Syed Ahmad Khan wrote various essays with the intention to inspire Muslim Community of British India to improve their condition. With the same intent 'Tehzeeb-ul-Akhlaq' was published in order to keep interest of the readers, he added fictional and psychological elements in his essays, but without effecting the cause of such writings. Fictional and psychological aspects contain different symbols but we see the different symbols consolidated in the essays of Sir Syed and so it becomes an important source to achieve his cause through his essays.

This articles critically analyses these symbolic and fictional elements in Sir Syed's writings.

سرسید احمد خان کی تحریروں نے زمانے کے تغیرات کے باوجود اپنی وسعت اور گہرائی کو منوایا ہے۔ ان کے مقالات کے کئی خصائص موضوع قلم بنے ہیں اور ان کی سوانح و شخصیت کے مختلف گوشے نمایاں کیے گئے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے ''حیات جاوید'' میں لکھا ہے:

> جس قدر زیادہ زمانہ گزرتا جائے گا اسی قدر سرسید کے کاموں میں زیادہ قدر اور ان کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی متعدد لوگ اس کی بائیوگرافی لکھیں گے اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔[(۱)]

بلاشبہ سرسید احمد خان کی سوانح و شخصیت اور ان کے مقالات کی خصوصیات پر تحقیقی و تنقیدی سطح پر بہت سا معیاری و مستند کام منظر عام پر آیا ہے جو سرمایہ سرسید احمد خان کے حوالے سے گراں قدر اضافہ ہے۔ زیر قلم مقالے میں سرسید احمد خان کے مقالات میں داستانوی و نفسیاتی عناصر کی موجودگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں پر سرسید احمد خان کی متانت اور مقصدیت ایسی غالب آئی کہ زیادہ تر محققین و ناقدین اور قارئین کی توجہ اسی مقصدیت کی جانب مبذول رہی اور داستانوی و نفسیاتی

پہلونظر انداز ہوتے رہے جبکہ سرسید احمد خان کے مقالات میں ان دونوں عناصر کے حوالے سے بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

داستانوی اور نفسیاتی پہلو کی حیثیت اگرچہ جدا جدا ہے لیکن سرسید احمد خان کی مقصدیت اور افادیت پسندی کی بنا پر ان کے مقالات میں یہ دونوں پہلو ایک دوجے سے جڑ جاتے ہیں اور سرسید احمد خان کے پیشِ نظر رہنے والے مقاصد کے حصول کا پرتاثیر ذریعہ بنتے نظر آتے ہیں۔ داستانیں، قصہ کہانی، مافوق الفطرت عناصر اور سبق آموز واقعات سے بھرپور ہوتی ہیں بلکہ کئی داستانوں میں واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے اس بات کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے ان سے اخلاقی و اصلاحی مقاصد حاصل ہوسکیں البتہ غالب عنصر تخیل اور رومان کا ہوتا ہے۔

نفسیات انسان کی باطنی کیفیات اور واردات کے نتیجہ میں جنم لینے والے مسائل اور اُن کے حل سے تعلق رکھتی ہے لیکن یہ ایک خاص رنگ میں مثبت مقاصد کے حصول کا موثر ذریعہ بن جاتی ہے اس کا تعلق حقیقت سے جڑتا ہے لیکن بعض اوقات اس حقیقت کو قوت متخیلہ کی وساطت سے صحیح سمت عطا کی جاتی ہے۔

سرسید احمد خان اپنے مقالات میں علم و ادب کے اِن دونوں وسیلوں سے کام لیتے ہوئے اپنا مقصد یا مدعا بیان کرنے پر قادر ہیں اور اپنے مقاصد کے تحت ان کا موزوں اور برمحل استعمال کرتے نظر آتے ہیں وہ خاص طور پر اجتماعی سطح پر قوموں کے مختلف افعال اور ان کے نتائج کا احاطہ کرتے ہوئے ایک نفسیات دان کا روپ دھار لیتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض قوم ہی نہیں انفرادی سطح پر ایک فرد کو بھی اس کے باطن سے آشنا کرنے کا فن جانتے ہیں اور اس کوشش میں وہ ایک روایتی قصہ گو کی طرح، نفسیاتی کیفیات کو سمجھتے اور سمجھاتے ہوئے فرد و قوم کو طمانیت و قرار کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کی اہمیت اور تشخص کے واقف کرواتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی مضامین میں قصہ گو جیسا طرزِ تخاطب اور اندازِ بیان اختیار کیا ہے مثلاً:

> شہر اور آبادی سے دور جنگل اور میدان سے پرے ایک نہایت خوش نما پہاڑ تھا چوٹی سے نیچے تک جا بجا قدرتی پھول کھلے ہوئے بلندی پر دن کو بھی پھول آسمان کے تاروں کا لطف دکھاتے اور پستی کے پھول گلستان یاد دلاتے ہے چوٹی برف سے سفید تھی۔ سرجیون پانی کی لٹیں بہتی تھیں جن سے قیاس ہوتا تھا کہ یہ نہایت پیرانہ سال مقدس پہاڑ ہے اس کا ایک ٹیلے کی اندھیری کوہ میں ایک زاہد آنکھیں بند کیے خدا کو ڈھونڈ رہا تھا۔(۲)

> برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا تھا رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے گھٹا چھا رہی ہے بجلی تڑپ تڑک کر کڑکتی ہے آندھی بڑے زور سے چلتی ہے دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے... ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔(۳)

ان دونوں مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ کچھ مضامین کے آغاز میں وہ ایک روایتی قصہ گو کی طرح اپنے قاری کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر کھینچتے ہیں اور پھر اسی منظر کے سحر میں ڈوبے قاری کو اپنے ساتھ ساتھ مضمون کے انجام تک لے جاتے ہیں۔

وہ اپنے مختلف مضامین میں اصلاح اخلاق کی غرض سے مختلف واقعات اور حکایتیں بھی درج کرتے ہیں مثلاً ''وحشیانہ نیکی'' میں وہ اپنی قوم کو تہذیب وشائستگی کی ترغیب دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہمارے قوم میں جس قدر نیکیاں ہیں وہ بھی نامہذب ہیں ان کو مہذب بنانے کے لیے تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے اس حوالے سے وہ ایک حکایت درج کرتے ہیں:

> نقل ہے کہ ایک شخص کے پاس دو حبشی لڑکے تھے... آپس میں دونوں کی جانی دوستی اور دلی محبت تھی اسی شخص کے پاس ایک حبشن نوعمر لڑکی بھی تھی جو اس قوم میں نہایت خوب صورت سمجھی جاتی تھی... اتفاقاً دونوں جوان لڑکے اس پر عاشق ہو گئے... آخر کار عشق اور دوستی میں جھگڑا ہوا... مگر کوئی جیت نہ سکا دونوں برابر رہے... تب وہ دونوں لڑکے اپنی معشوقہ کو ایک جنگل میں لے گئے اور دونوں نے اسے چھری مار کر مار ڈالا... اور پھر دونوں نے اپنے تئیں بھی مار ڈالا۔(۴)

اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ مس ولیم گرے جو مصر کی ایک دعوت میں پرنس اینڈ پرنسس آف ویلز کے ساتھ تھیں اس دعوت کا حال یوں لکھتی ہیں:

> کھانے کے کمرے کے اندر چاندی کی ایک گول میز بچھی ہوئی تھی فرش سے ایک فٹ اونچی اور ایک بڑا خوان معلوم ہوتی تھی... سب سے پہلے ایک قاب میں مرغ شوربا اور چاول یعنی خشکہ آیا اور سپی کے چمچے ملے مگر نہ چھری تھی نہ کانٹا تھا... بیس قسم کے کھانے تھے جو ہاتھوں سے اور انگلیوں سے توڑ توڑ کر کھائے جاتے تھے۔(۵)

اس کے بعد وہ ایک جملے میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں:

> کھانے تو ہوویں فرعونی اور طریق کھانے کا ہو مسنونی۔(۶)

دراصل یہ واقعہ ''طریقہ زندگی'' کے حوالے سے کھانے کے طریقوں پر مہذب قوموں اور غیر مہذب قوموں کے موازنے پر مشتمل ہے لکھتے ہیں کہ مس ولیم گرے بتاتی ہیں:

> جس قدر مجھ کو اس سے نفرت ہوئی اور پھریری آ آ کر قے ہونے کی نوبت ہوئی ایسی کبھی نہیں ہوئی کھانے میں انگلیوں کو ڈبویا جاتا دیکھ کر انگلیوں سے توڑ کر کھانے سے ایسی نفرت آمیز گھن آتی تھی کہ میں نے ایک آدھ دفعہ تو کھانے سے انکار کر دیا مگر جو

بیگم میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں انھوں نے جانا کہ میں شرماتی ہوں تو ہر دفعہ کھانا اپنے
ہاتھ سے لے کر میری رکابی میں رکھ دیتی تھیں... اور میرا جی متلاتا جاتا تھا۔(۷)

دراصل ان واقعات اور حکایتوں کے ذریعے وہ اپنے مدعا کو قاری کے دل و دماغ میں راسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی قوم کے مزاج اور نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔اس عہد کے قومی مزاج پر داستانوں کا رنگ غالب تھا۔لوگ کہانیوں سے لطف اٹھاتے اُن میں دلچسپی لیتے اور کبھی کبھی سبق آموز واقعات سے زندگی گزارنے کے گر بھی سیکھ لیتے تھے چنانچہ سرسید احمد خان نے ایک ماہر،نفسیات دان کی طرح اس مزاج اور تقاضے کو سمجھتے ہوئے اپنے مضامین مین دلچسپ قصے اور واقعات تحریر کیے۔ کچھ مضامین میں تو انھوں نے کہانی کا تاثر دیتے ہوئے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔مثلاً:

حضرت مبارکا باشد،مل تو لیجیے،معانقہ تو فرمائیے۔
آیئے آیئے تشریف رکھیے۔
دل ملے ہوئے ہوں تو معانقہ کی کیا ضرورت ہے۔
کیا آپ معانقہ عید کو جائز نہیں سمجھتے؟...(۸)

کافر کافر
کیوں حضرت کافر کیوں؟
تم نے کیا کہا؟
میں نے کہا انا مومن ان شاء اللہ۔(۹)

اس مکالماتی انداز سے بھی مضمون میں کہانی کا سا لطف پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سرسید احمد خان قلم ہاتھ میں لیے محض اپنے مقاصد کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے بلکہ ہلکے پھلکے بات چیت اور کہانی کہنے کے انداز میں اپنے افکار اور نظریات کی تبلیغ کرتے ہیں۔

ان مضامین میں مقولوں کا استعمال بھی کثرت سے نظر آتا ہے اس کا سبب بھی یہی نفسیاتی نکتہ ہے کہ کہنے یا لکھنے والے سے زیادہ لوگ کسی خاص انسان یا قوم کے مقولے اور تہذیبی روایات کو اہم گردانتے ہیں چناں چہ سرسید احمد خان مختلف مقولوں کے ذریعے دل کی بات دل تک پہنچاتے ہیں مثلاً:

یہ ایک نہایت عمدہ قول ایک بڑے فلاسفر کا ہے کہ زمانہ سب سے بڑا ریفارمر یعنی مصلح
امارت ہے۔(۱۰)
کسی شخص کا قول ہے کہ محبت کسی حیثیت سے ہو ایک ایسی چیز ہے کہ محبوب کی دوستی

دل میں بٹھا دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کافروں سے دوستی و محبت کسی وجہ سے کیوں نہ ہوممنوع ہے۔(۱۱)

خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں'' یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔(۱۲)

پسٹلی صاحب کا قول ہے کہ انسان کو دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھنا چاہیے کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جاوے تو اس کے ضرر سے بچنے کی جگہ رہے۔(۱۳)

مسٹر ایڈیسن کا قول ہے کہ مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں ایک اعتقادیات دوسرا عملیات۔(۱۴)

ان مقولوں کی وساطت سے وہ قاری کی نظر میں اپنے مدعا کی اہمیت وافادیت کو یقینی بناتے ہیں۔مقولوں کے علاوہ ان کے مقالات میں شاعرانہ نثر کے نمونے بھی ملتے ہیں جن سے داستانوی رنگ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور مضامین کی تاثیر میں بھی دوگنا اضافہ ہو جاتا ہے:

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک، اے آسمانوں کے تارو تمھاری خوش نما چمک اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو... اس دوری ہی نے تم کو یہ خوب صوتی بخشی ہے۔(۱۵)

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے۔(۱۶)

وہی تو خدا ہے جو بجلی کی چمک سے ڈراتا ہے اور مینہ سے لالچ دلاتا ہے۔ بھاری بھاری بادل اٹھاتا ہے۔ رعد سے تسبیح پڑھواتا ہے۔(۱۷)

جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا ہی پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔(۱۸)

اس نثر کو پڑھتے ہوئے مضمون کے سنجیدہ موضوع میں چھپی مقصدیت و متانت ایک لمحے کو بھول جاتی ہے لیکن سرسید احمد خان کا کمال ہے کہ وہ اپنے قاری کو اس شعری فضا سے ایک ماہر نفسیات دان کی طرح باہر بھی نکال لاتے ہیں اور اپنے مقصد کو فراموش نہیں کرتے۔

شاعرانہ نثر کا استعمال، حکایتوں اور مختلف واقعات کو تحریر کرنا مختلف مقولوں کے ذریعے اپنی بات کی اہمیت کو ثابت کرنا یہ سب خصائص اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ایک قابل مصنف کی طرح بڑی مہارت سے قاری کی نفسیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، اس کی دلچسپی اور مزاج کو بھی اہم گردانتے ہیں اور بات کو اس طرح رقم کرتے ہیں کہ قاری کی ذہنی و نفسیاتی تشفی ممکن ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مختلف اخلاقی و اصلاحی اور تاریخی مضامین میں اپنے قاری کی نفسیات کو ملحوظ رکھا ہے چناں چہ جہاں انھوں نے کسی باطنی کیفیت یا حالت کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے نتائج و اثرات بھی بیان کیے ہیں اور اس کیفیت یا حالت سے جنم لینے والے مسائل کا حل بھی تجویز کیا ہے مثلاً:

> دشمنی اور عداوت، حسد اور رنجش اور ناراضی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو خود اسی شخص میں کمینہ عادتیں اور رزیل اخلاق پیدا کرتا ہے اور بعوض اس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچاوے خود اپنا آپ نقصان کراتا ہے اس انسانی جذبے کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔(۱۹)

> تعصب انسان کو ہر طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔(۲۰)

> اوّل اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے ہیں وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔(۲۱)

> انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث ومباحثہ بھی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب وشائستگی محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔(۲۲)

گویا اخلاقی اور باطنی حوالے سے وہ جس اصلاح کے متمنی ہیں اس کے لیے وہ داستانوی انداز بیان تو اختیار کرتے ہیں لیکن اُن کے ہاں محض قصے کہانی یا کہانی در کہانی یا سبق آموز واقعات کا ذکر نہیں ملتا بلکہ وہ ان تمام کہانیوں، واقعات اور سبق آموز مقولوں کو انسانی نفسیات کے تحت بیان کرتے ہیں اور باطن کی اصلاح کے لیے باطن کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں وہ فرد ہو یا قوم ہر دو حوالوں سے نفسیاتی پہلوؤں کی تصویر کشی کرتے ہیں اور پھر مختلف نفسیاتی مسائل کو باطنی حقائق کے طور پر پیش کرتے ہیں مثلاً ان کے مضامین سمجھ، نیکی، کاہلی، خوشامد، ریا، تعصب، انسان وحیوان، بحث وتکرار وغیرہ اس حوالے سے دیکھے جاسکتے ہیں اپنے مضمون ''عزّت'' میں لکھتے ہیں:

> تمام افعال انسان کے جو صرف ظاہری نمائش کے طور پر کیے جاتے ہیں گو لوگ ان کی عزت کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ عزت کے مستحق نہیں ہیں عزت کے لائق وہی کام ہیں جن کو دل بھی قابل عزت سمجھے۔(۲۳)

''اپنی مدد آپ'' میں کہتے ہیں:

> آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسے کرتے جاتے ہیں خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ بھی پر کیوں نہ کریں وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔(۲۴)

مندرجہ بالا حقائق کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جنگ آزادی کی ناکامی سے جنم لینے والے اُس مایوس اور غیر فعال عہد کی فضا کو ہی نہیں بلکہ آج ہمارے دور کے انسانوں کے لیے بھی یہ باتیں اکسیر ہیں۔ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ میل جول، برتاؤ، سلوک، محبت، اخلاص اور تعاون کے ساتھ ساتھ اتحاد واتفاق ہی سے معاشرے یا قوم کو مہذب اور ترقی یافتہ بنایا جاسکتا ہے۔ سرسید احمد خان نے جو اخلاقی واصلاحی تربیت اور تعلیم اپنے عہد میں کرنے کی ٹھانی تھی اُس کی آج بھی بہت ضرورت ہے اور سرسید کے یہ مضامین اسلوب کے اعتبار سے آج کے قاری کے لیے خواہ مشکل ہوں مگر غیر افادی نہیں ہیں اس کی وجہ اُن کی یہی خوبی ہے کہ وہ زمانے کے نبض شناس تھے اور ایسے ماہر نفسیات کہ اُن کے کہے جملے اور باتیں آج کے انسان کے روّیوں پر بھی صادق آتے ہیں۔ ان کے مضامین اسی لیے آفاقیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے اپنی قوم کی فکری وعملی بے راہ روی کے لیے جو طرز بیان اختیار کیا اور جو معلومات بہم پہنچائیں اُن کی آج بھی اشد ضرورت ہے۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر سی ڈبلیو ٹرول، سر سیّد احمد خان فکرِ اسلامی کی تعمیرِ نو، مترجم: ڈاکٹر افضل حسین قاضی، (لاہور: القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۳

(۲) سرسیّد احمد خان، مقالات سر سیّد، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، حصہ پانزدھم، (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۲۰۰۱ء) ص ۵۰

(۳) ایضاً، حصہ پنجم، ایضاً، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵۷

(۴) ایضاً، ص ۳۳۶

(۵) ایضاً، ص ۳۸

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً

(۸) ایضاً، حصہ پانزدہم، ص ۶

(۹) ایضاً، حصہ پنجم، ص ۱۷۵

(۱۰) ایضاً، حصہ پانزدہم، ص ۱۴۴

(۱۱) ایضاً، حصہ پنجم، ص ۶۷

(۱۲) ایضاً، ص ۱۷

(۱۳) ایضاً، حصہ پنجم، ص ۲۴۴

(۱۴) ایضاً، ص ۳۱۸

(۱۵) ایضاً، حصہ پانزدہم، ص ۱۹

(۱۶) ایضاً، ص ۳۵

(۱۷) ایضاً، ص ۱۵۰

(۱۸) ایضاً، مولانا، حصہ پنجم، ص ۳۳۱

(۱۹) ایضاً، ص ۳۳۵

(۲۰) ایضاً، ص ۳۴۷

(۲۱) ایضاً، ص ۳۳۱

(۲۲) ایضاً، ص ۱۶۰

(۲۳) ایضاً، ص ۱۱

(۲۴) ایضاً، ص ۱

مآخذ:

(۱) ٹرول، سی ڈبلیو، ڈاکٹر، سر سیّد احمد خان فکرِ اسلامی کی تعمیرِ نو، مترجم: ڈاکٹر افضل حسین قاضی، (لاہور: القمر

انٹرپرائزز، ۱۹۹۸ء)،ص ۲۳

(۲) خاں، سر سیّد احمد، مقالات سر سیّد، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، حصہ پانزدھم، (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۲۰۰۱ء)ص ۵۰

(۳) ______، حصہ پنجم، ایضاً، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵۷

(۴) ______، حصہ پانزدہم، ص ۶